اُردو خاکہ نگاری اور گیان چند جین کا خاکہ ("فراقؔ صاحب سے میری ملاقاتیں") ایک مطالعہ

ڈاکٹر عرفان اللہ خٹک (اسسٹنٹ پروفیسر) گورنمنٹ ڈگری کالج ککی بنوں

A 'pen picture' is what is traditionally called a short bio-sketch, or personal sketch. It tells the story of a person's character, life, and achievements. A biographical sketch is shorter and much more specific. The sketch should provide readers with basic information about the person, and give them a sense of the person's character. A biographical sketch can be written to give people more information about a historical figure. Here an attempt is made for critical analysis a biographical sketch written by Dr. GYAN CHAND about a famous poet, FIRAQ GORUKHPURI. Dr. GYAN CHAND has only highlighted the negative aspects of FIRAQ's life while a biographical sketch is an interesting combination of dark and good traits of the person. He has ignored to discover the dormant shades of FIRAQ's life. He turned black a number of pages in uncovering FIRAQ's homosexuality and vanity.

خاکہ نگاری دورِ جدید کی پروردہ ایک منفرد و مقبول صنف ہے۔ جو دیگر کئی اصناف کی طرح انگریزی ادب کے زیرِ اثر اُردو ادب میں داخل ہوئی۔ خاکہ ایک ایسا شخصی مضمون ہے جس کے ذریعے فردِ واحد کی مختصراً اس انداز میں تصویر پیش کی جاتی ہے۔ کہ اس سے متعلقہ شخص کی آدھی ادھوری شخصیت اپنی تمام تر لطافتوں اور نفسیات کے ساتھ سامنے آئے۔ اُردو میں خاکہ کو شخصیت نگاری یا مرقع نگاری کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ جبکہ انگریزی میں اس صنف کے لیے سکیچ (Sketch) یا پن پورٹریٹ (Pen Portrait) کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی لکھتے ہیں:

> "ادب کی جس صنف کے لیے انگریزی میں سکیچ یا پن پورٹریٹ کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اُردو میں اسے خاکہ کہتے ہیں"(1)

ڈاکٹر محمد عمر رضا اس حوالے سے رقمطراز ہیں:

> "خاکہ دراصل انگریزی لفظ (Sketch) کا مترادف ہے جس کے معنی کچا نقشہ، ڈھانچہ یا لکیروں کی مدد سے بنائی ہوئی تصویر کے ہیں لیکن ادبی اصطلاح میں اس سے مراد وہ نثری تحریر ہے جس میں نہایت مختصر طور پر اشارے کنائے میں کسی شخصیت کا ناک، نقشہ، عادات و اطوار اور کردار کو سیدھے سادھے انداز اور روانی کے ساتھ بیان کر دیا جائے لیکن اس کے ساتھ ہی اس میں کسی ایک فرد کے مختلف گوشوں کی اس انداز میں حقیقی اور جیتی جاگتی تصویر پیش کی جاتی ہے۔ جس سے فرد کی مکمل تصویر آنکھوں کے سامنے آجائے۔(2)

خاکہ نگاری بہت مشکل اور نازک فن ہے اسے اگر نثر میں غزل سے تشبیہ دی جائے تو بے جانہ ہوگا کہ اس میں غزل کی طرح محدود الفاظ میں طویل مطالب ادا کرنے پڑتے ہیں۔ خاکہ نگار سوانح عُمری سے زائد حصے کو الگ کر کے کسی شخصیت کا اصل رُوپ ہمارے سامنے لاتا ہے۔ اس کے لیے ہم مشہور سنگ تراش مائکل انجلو کے مثال سے واضح کر سکتے ہیں جس نے کہا تھا کہ مجسمہ ساز، مجسمہ سازی نہیں کرتا۔ مجسمہ تو پہلے مرمر میں موجود رہتا ہے۔ وہ صرف مرمر کی ان تہوں کو چھیل کر نکال دیتا ہے، جس کے پیچھے کوئی صورت جلوہ نمائی کی منتظر رہتی ہے۔ مائیکل انجلو کی یہ بات واقعی خاکہ نگاری کے فن پر صادق آتی ہے۔ جس میں کسی شخص کی پیدائش سے موت تک کے حالات کو اس کے سماجی اور تہذیبی شعور کے ساتھ اس ڈھنگ سے پیش کیا جاتا ہے۔ جس سے اس شخصیت کے تمام خط و خال اپنی تمام تر نفسیات کے ساتھ قاری کے سامنے آجائے۔ ڈاکٹر ابوالخیر کشفی اپنے مضمون "ادبی اصطلاحات" میں خاکہ کو پورٹریٹ کے مماثل قرار دیتے ہیں اور لکھتے ہیں:

"سوانح عمری اگر کسی شخصیت کے مختلف فوٹوز کے ساتھ البم ہے تو خاکہ پورٹریٹ کا درجہ رکھتا ہے۔(3)

جبکہ ڈاکٹر بشیر سیفی اس رائے کی قطعی مخالفت کرتے ہوئے لکھتے ہے:

"میری رائے میں خاکہ پورٹریٹ کا نہیں سکیچ کا درجہ رکھتا ہے البتہ شخصیت نگاری کے لیے پورٹریٹ کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔"(4)

ڈاکٹر سلیم اختر نے ان اصطلاحات کی یوں توضیع کی ہے:

"مصوّری کی اصطلاح میں بات کرتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ سوانحی مضمون رنگین پورٹریٹ ہے جس میں مصور پسِ منظر اور پیش منظر کو اُجاگر کرتے ہوئے شبیہ سے وابستہ تمام جزئیات نمایاں کرتا ہے۔ جب کہ خاکہ پنسل سکیچ ہے جس میں کم سے کم لائنوں سے چہرہ کا تاثر واضح کیا جاتا ہے۔ اب یہ مصور کا اپنا وجدان اور فنی شعور ہے کہ وہ تاثر کو اُبھارنے کے لیے چہرے کے کن خطوط کو نمایاں کرتا ہے۔"(5)

مختصر طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ خاکہ شخصیت کی دریافت اور انکشاف کا عمل ہے اس لیے مختصر الفاظ میں کسی شخصیت کے نمایاں اوصاف خاص سلیقے سے اُجاگر کرنا کہ جس کے آئینے میں پوری شخصیت کا عکس نظر آئے خاکہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

خاکہ کے فنی لوازمات میں اختصار، وحدت تاثر، سراپا نگاری یا حلیہ نگاری، واقعات کا انتخاب، غیر جانبداری، اعتدال و توازن اور شگفتہ اسلوب شامل ہے۔ اُردو میں خاکہ نگاری کا باقاعدہ آغاز تو بیسویں صدی کے شروع میں ہوا لیکن میر تقی میرؔ کے "نکات الشعراء" غلام ہمدانی مصحفیؔ کے "تذکرہ ہندی" غلام مصطفیٰ خان شیفتہؔ کے "گلشنِ بے خار" اور سعادت یار رنگین کے "خوش معرکہ زیبا" میں خاکہ کے نقوش ابتدائی طور پر ضرور ملتے ہیں۔ ان قدیم تذکروں کے بعد اُنیسویں صدی کے اواخر میں محمد حسین آزادؔ کی "آبِ حیات" نے خصوصاً ادباء کو اس صنف سے روشناس کرایا۔ جس میں آپ نے مختلف شعراء کے حلیے، ان کے لباس اور بات چیت کے انداز کو تفصیل سے بیان کر کے ان کی چلتی پھرتی

تصویر دکھانے کی کوشش کی تھی مگر اول تو یہ تصویریں دُھندلی اور نامکمل ہیں ثانیاً آزاد کی تمام تر توجہ شعراء کے لباس اور حلیوں پر مرکوز رہی جس کے باعث یہ تصاویر نامکمل ہیں کہ اس میں زندگی کی حرارت نہیں پائی جاتی۔ بحر حال آزاد کی ان کوششوں کو اُردو خاکہ کے اولین نمونوں سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ اس کا خاکہ نگاری کے ارتقاء میں عمل دخل ہے۔ باقاعدہ آغاز فرحت اللہ بیگ کی تحریر "نذیر احمد کی کہانی، کچھ میری کچھ ان کی زبانی" سے تسلیم کیا جاتا ہے۔ فرحت نے آزاد تقلید میں نہ صرف حلیہ نگاری پر اپنی توانائی صرف کی بلکہ ایک قدم آگے بڑھ کر ان کی بنائی گئی تصاویر کو متحرک کر کے ان میں زندگی کی لہر دوڑائی۔ فرحت اللہ بیگ کے بعد ہم رشید احمد صدیقی کو دوسرا باقاعدہ خاکہ نگار قرار دے سکتے ہیں۔ جن کے مزاح پاروں کے مجموعوں "گنجہائے گراں مایہ" "ہم نفسانِ رفتہ، اور "ذاکر صاحب" نے اُن کو خاکہ نگاروں کی فہرست میں اہم مقام دلایا۔ ۔رشید احمد صدیقی کے بعد خاکوں کے حوالے سے اہم نام "چراغ حسن حسرت" کا ہے جن کے مجموعے "مردم دیدہ" کے خاکے "آغا حشر" اور "ظفر علی خان" لاجواب ہیں۔ اِن کے بعد شوکت تھانوی کی کتاب "شیش محل" کو خاکے کے ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔ اس میں بھی جزدی پر خاکہ پایا جاتا ہے اس میں شامل مضامین اگر قابلِ مطالعہ ہیں تو اس کی بنیادی وجہ اُس کی مزاحیہ طبیعت ہے۔

قیام پاکستان سے قبل اُردو میں خاکہ نگاری کا اختتام عصمت چغتائی کے خاکہ "دوزخی" پر ہوتا ہے جس میں اُنہوں نے اپنے بھائی عظیم بیگ چغتائی کا خاکہ کھینچا ہے۔ عام طور پر اس خاکے کو اُردو کے بہترین خاکوں میں شمار کیا جاتا ہے تاہم راقم کے خیال کے مطابق یہ ایک یک رُخی خاکہ ہے۔ بہن نے بھائی کو مبالغے کی حد تک برا بیان کیا اور چونکہ یہ مشرقی روایات کے خلاف ہے اس لیے اس نئے تجربے کی بناء پر فاضل نقادوں نے اسے لازوال کیا۔ حالانکہ یہ توازن سے عاری ہے۔

قیام پاکستان کے بعد رئیس احمد جعفری کے چند خاکے جو "دید و شنید" میں شامل ہیں اہم تصور کیے جاتے ہیں۔ لیکن پہلا اہم ترین نام سعادت حسن خان منٹو کا ہے۔ منٹو بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں اور اُن کے متعلق یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اُن کے افسانے جنس کے گرد گھومتے ہیں تاہم منٹو کے خاکے اس الزام سے بری الذمہ ہیں۔ 1955ء میں نقوش کا شخصیات نمبر شائع ہوا لیکن اس میں بھی بعض سوانحی، تعارفی اور واقعاتی مضامین کو خاکے کے زمرے میں لایا گیا۔ اس کے بعد اخلاق احمد دہلوی کے مضامین کی کتاب 1957 میں "اور پھر بیاں اپنا" کے نام سے شائع ہوئی جس میں "سنگ اُٹھایا تھا کہ سر یاد آیا" جیسا لازوال خاکہ لکھا گیا۔ عہد بہ عہد شائع شائع ہونے والے خاکوں کے مجموعے کے مطالعہ سے یہ بات سامنے آتی ہے۔ کہ قیام پاکستان کے بعد سعادت حسن منٹو اولین اہم خاکہ نگار ہیں اور اس کے بعد شاہد احمد دہلوی کا نام اہمیت رکھتا ہے جس کے خاکوں کا اوّلین مجموعہ "گنجینہء گوہر" 1962 میں شائع ہوا۔ خاکہ نگاری میں آپ کو خصوصی امتیاز حلیہ نگاری کے باعث حاصل ہوا بقولِ ڈاکٹر یحییٰ امجد:

> "چہرہ نویسی کے باب میں کوئی ان کا حریف نہیں ہے۔ دوسروں کے لکھے ہوئے چہرے پڑھ کر آپ دھوکا کھاسکتے ہیں اس چہرے سے ملتی جلتی شکل پر اس خاص چہرے کا گمان کر سکتے ہیں مگر شاہد صاحب کا چہرہ اگر ملے گا تو اُسی خاص آدمی کی گردن پر"(6)

شاہد احمد دہلوی کے بعد خاکہ نگاری کے ضمن میں مدیر "نقوش" محمد طفیل کا نام اہمیت رکھتا ہے۔ محمد طفیل اُردو کے خاکہ نگاروں میں اس لحاظ سے ممتاز ہیں کہ اُنہوں نے صرف اسی صنف کو اپنایا۔ ان کے خاکوں کے 8 مجموعے "صاحب" "جناب" "آپ" "محترم" "مکرم" "معظم" "محبّی" اور مخدومی" اشاعت پزیر ہو کر دادِ تحسین وصول کر چکے ہیں۔

اشرف صبوحی کی کتاب "دلی کی چند عجیب ہستیاں" 1963 میں شائع ہونے والی خاکوں کی اہم کتاب ہے۔ اشرف صبوحی کے بعد "ممتاز مفتی" کے خاکوں کا مجموعہ "پیاز کے چھلکے" منظر عام پر آیا جس میں خاکہ نگاری کے تمام لوازم کا خیال رکھا گیا ہے۔ سید ضمیر جعفری کے مضامین مجموعہ "کتابی چہرے" ایسے مضامین پر مشتمل ہے جو وقتاً فوقتاً اہلِ قلم کی کتابوں کی رونمائی کے مواقع پر پڑھے گئے۔ سید ضمیر جعفری کے خاکوں کے بارے میں بشیر سیفی لکھتے ہیں:

> "خاکہ میں سیرت کے روشن پہلو اُبھارنے کے ساتھ ساتھ تاریک پہلوؤں کا فنکارانہ اظہار بھی ضروری ہے ورنہ خاکہ نامکمل اور سمجھا جاتا ہے اس حوالے سے "کتابی چہرے" کا مطالعہ کیا جائے تو احساس ہوتا ہے کہ سید ضمیر جعفری اپنے ممدوحین کی خامیوں سے عموماً صرفِ نظر کر جاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے خاکوں میں محبت وعقیدت اور احترام کا جذبہ خاصا نمایاں ہے۔ اس کے باوجود بھی چراغ حسن حسرت کا خاکہ "سنگاپورا کا میجر حسرت" اور عزیز ملک کا خاکہ "ادب کا حجرہ شاہ مقیم" فنی طور پر مکمل خاکے ہیں۔ (7)

"کتابی چہرے" کے علاوہ "میٹھا پانی" اور "اُڑتے خاکے" بھی آپ کے خاکوں کے مجموعے ہیں۔ فارغ بخاری نے اپنے شخصی مضامین کے مجموعے "البم" اور "دوسرا البم" بھی اگرچہ خاکوں کے نام سے پیش کی۔ رحیم گل کے خاکوں کا مجموعہ "پورٹریٹ" شگفتہ اور رواں اسلوب میں لکھی گئی کتاب ہے۔ اس کتاب کے تمام مضامین کو خاکے کے ذیل میں نہیں لایا جاسکتا۔ فارغ بخاری کا خاکہ خاصا تشنہ ہے اور اس سے شخصیت سے ملنے میں تامل ہوتا ہے۔ خاطر غزنوی کا خاکہ اُس کے مشاغل تک محدود ہے البتہ قتیل شفائی، ابراہیم جلیس، ریاض شاید، عطاء الحق قاسمی کے خاکے بہترین ہیں۔ اس دور کے ایک نامور خاکہ نگاری نظیر صدیقی ہیں جن کے مجموعے کا نام "جان پہچان" ہے۔ عطاء الحق قاسمی نے اپنے مجموعہ مضامین "عطایئے" کے ایک حصے کو "خاکے" کے عنوان مرتب کیا ہے۔ محمد ایوب قادری کی کتاب "کاروانِ رفتہ" صادق الخیری کی کتاب "نایاب ہیں ہم" اور اے حمید کی "سنگ دوست" بعد میں آنے والے خاکوں کے مجموعوں میں اہم تصور کیے جاتے ہیں۔ اے حمید کے خاکوں میں افسانوی رنگ نمایاں ہے احمد ندیم قاسمی، قدرت اللہ شہاب اور چراغ حسرت کے خاکوں میں اگرچہ آپ بیتی کا رنگ غالب ہے تاہم مجموعی طور پر یہ خاکہ نگاری کی ذیل میں بہترین خاکوں کا مجموعہ ہے۔ علاوہ ازیں نصر اللہ خان کا "قافلہ جاتا رہا" لطیف کاشمیری کا "جمالِ ہم نشیں اور حافظ لدھیانوی کا "متاعِ گم گشتہ" خاکہ نگاری کے ضمن میں اہم گردانتے جاتے ہیں۔ تاہم اس پورے ارتقاء سے یہ بات سامنے آتی ہے۔ کہ اُردو ادب میں بہت ہی کم خاکے حقیقی معنوں میں خاکے تصور کیے جاسکتے ہیں۔ ان میں زیادہ تر سوانحی مضامین اور تعارفی مضامین ہیں خاکہ نگاری کے اس جائزے کے بعد ہم گیان چند جین کے خاکے "فراق صاحب سے میری ملاقاتیں" کو خاکہ نگاری کی کسوٹی

پر پرکھتے ہیں اور جانچنے کی سعی کرتے ہیں کہ کیا یہ خاکہ، خاکہ نگاری کے مروّجہ اُصولوں پر پورا اُترتا ہے۔ کسی بھی خاکے کی کامیابی کے لیے لازمی ہے کی اس میں نمائندہ اور مختصر واقعات کا احاطہ کیا جائے۔ لیکن جب ہم گیان چند کے خاکے "فراقؔ صاحب سے میری ملاقاتیں" کو ملاحظہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کی اس میں شامل واقعات کسی طور بھی اُن کی زندگی کی نمائندگی نہیں کرتیں۔ فراقؔ صاحب کو دنیا ایک بڑے شاعر کے طور پر جانتی ہے لیکن خاکہ نگار ان نمائندہ واقعات کو خاکے میں جگہ نہیں دیتا۔ خاکے کے آغاز میں گیان چند جین لکھتے ہیں:

> "بڑے ادیب، بالخصوص تخلیقی ادب کی زندگی کا ہر گوشہ عوام کی ملکیت ہے اس کے شائقین کو حق ہے کہ اس زندگی کے ہر پہلو، خواہ وہ کمزور ہو یا تاریک ہی کیوں نہ ہو۔ پوری شخصیت میں انسانی دلچسپی کا سامان زیادہ ہوتا ہے۔ اسی اصول کے تحت میں فراقؔ جیسے بڑے شاعر کی زندگی اور شخصیت کے بعض وہ پہلو سامنے لا رہا ہوں جن سے اُن کی تصویر زیادہ مکمل اور حقیقی ہو سکے گی"(8)

یہ تھے وہ الفاظ جو گیان چند جین کے اس خاکے کے ابتداء میں رقم کیے جیسے درج بالا سطور میں "کمزور اور تاریک" کے الفاظ پر نظر پڑتی ہے تو فوراً ذہن ٹامک ٹوئیاں مارنے لگتا ہے اور وہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ یہ تو یک رُخی ہی لگتا ہے۔ یک رُخی خاکہ وہ خاکہ ہوتا ہے جس میں خاکہ نگار کسی ایک پہلو کو سامنے لاتا ہے جب کہ باقی پہلو نظر انداز ہو جاتے ہی۔ خاکہ یک رخی نہیں ہونا چاہیے اس میں روشن اور تاریک دونوں قسم کے واقعات درج ہوں تاکہ پوری شخصیّت قارئین کے سامنے آ سکے۔ دوزخی "یک رُخے خاکے کی بہترین مثال ہے جس میں "عصمت چغتائی" نے اپنے بھائی "عظیم بیگ چغتائی" کو ایک مجسّم شیطان بنا کر پیش کیا حالاں کہ انسان خوبیوں اور خامیوں کا مجموعہ ہے۔

جیسے کہ راقم نے درج بالا سطور میں بتایا کہ آغاز سے ہی آپ کا ذہن "فراقؔ صاحب" کی تاریک زندگی کی جانب منتقل ہو جاتا ہے۔ اس خاکے میں فراقؔ صاحب کی وہ دھجیاں اُڑائی گئی ہیں کہ الامان والحفیظ۔ خاکہ نگار کا ہمدردانہ نقطہء نظر خاکے کی شان بڑھاتی ہے۔ ہمدردانہ نقطہء نظر سے میری مراد قطعاً مدلّل مداحی نہیں لیکن بہر کیف اس خاکے میں یہ بات مفقود ہے۔ خاکے کے ابتداء میں گیان چند جین اپنی پہلی ملاقات کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> "جب میں نے جولائی 1941 میں الہ آباد یونی ورسٹی میں بی۔ اے میں داخلہ لیا تو معلوم ہوا کہ فراقؔ صاحب یہاں پر انگریزی کے پروفیسر ہیں۔ پہلے تو میں نے خیال کیا کہ شاید مسلمان ہیں لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ جناب ہندو ہیں اور اصل نام رگھوپتی سہائے فراقؔ گورکھپوری ہے"(9)

فراقؔ صاحب کی امرد پرستی کے واقعات کو آپ نے ضرورت سے زیادہ اُچھالا، لکھتے ہیں:

> "الہ آباد میں فراقؔ صاحب اپنی جوانی ہی میں ایک روایت بن چکے تھے۔ ان کی امرد پرستی کے بارے میں کتنے ہی سچّے جھوٹے قصّے مشہور تھے جن کے سبب نئے نئے طالب علم ان سے بہت گھبراتے تھے۔ یونی ورسٹی میں انہیں دور سے دیکھ لیتے تھے پاس جانے کی ہمّت نہ ہوتی تھی۔"(10)

اُن کے اس قبیح فعل پر گیان چند نے صفحے کے صفحے کالے کر دیے اور مختلف واقعات سے اُن کو امرد پرست ثابت کیا مثلاً لکھتے ہیں:

"سقراط بھی اس قبیح فعل کا مرتکب ہوا تھا"(11)

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"ایک لڑکا رام گوپال جو بعد میں مختلف گورنمنٹ کالجز کے انتہائی سخت گیر پرنسپل ثابت ہوئے۔ انگریزی سیکھنے گئے تو فراقؔ صاحب نے اُن سے بدتمیزی کی"

خاکہ نگار لکھتا ہے:

گمان ہو سکتا ہے کہ فراقؔ صاحب کی امرد پرستی اُن کی اہلیہ سے ناآسودگی کے سبب تھی لیکن ایسا ہرگز نہ تھا"(12)

مزید لکھتا ہے:

"اُن کی زندگی میں کوئی محبوبہ نہ تھی بلکہ صنف نازک کے ساتھ برائے نام التفات بھی نہ کیا"(13)

اس امرد پرستی کے واقع کو مزید شہہ درج ذیل بیان سے ملتی ہے:

"فراقؔ نے 1914 میں شادی کی اور 1956 میں اپنی بیوی کو گھر سے نکال دیا۔ انہی عادات کے باعث اُن کے بیٹے نے خودکشی کی اور گمان یہ ہے کہ اُن کے بیٹے کے دوست ان سے ملنے آئے تھے اور فراقؔ صاحب نے ان سے دست درازی کی کوشش کی"(14)

ان تمام باتوں سے کہیں بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ فراقؔ صاحب کی امرد پرستی انتہا درجے کی تھی بلکہ ہر جگہ خاکہ نگار نے گمان کا لفظ لگا کر اپنا دامن بچانے کی کوشش کی۔ جن سے ہمیں یہ بھی گمان ہوتا ہے کہ کہیں گیان چند جین اپنا کوئی پرانا حساب تو نہیں چکا رہے۔

گیان چند جین نے اس مشہور و معروف یک رُخی خاکے میں فراقؔ صاحب کو ایک متعصّب انسان ثابت کرنے کی کوشش کی، فرماتے ہیں:

"غالبؔ کو بڑا شاعر خیال کرتے تھے اور اقبالؔ سے سخت نفرت تھی اس کی بنیادی وجہ اُن کا مسلمان ہونا تھا کہ وہ ہر وقت اسلام، اسلام کا نعرہ لگاتے"(15)

اس کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ عمر کے آخری حصے میں ہندوؤیت کا پرچار کرنے لگے تھے اور فرماتے کہ ہمارا تو ایک شاعر زندہ ہے لکھتے ہیں:

"ان لوگوں (مسلمانوں) نے ہندو شاعروں کو ختم ہی کر دیا اس شاعر کو دیکھیے جس کا صرف ایک شعر باقی رکھا ہے۔ اُن کا اشارہ مہاراجہ رام نرائن کی طرف تھا جس کا یہ شعر زبان زدعام ہے۔

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی

دِوانہ مر گیا، آخر کو ویرانے پہ کیا گزری(16)

گیان چند جین، فراقؔ کے ادبی نظریے کے بارے میں لکھتا ہے:

"وہ ہندی کو کمتر خیال کرتے اور اُردو زبان سے بہت محبت کرتے۔ ہندی کو ڈرائنگ روم کی گوبر سمجھتے۔(17)

گیان چند جین، فراقؔ کی نرگسیت کی نسبت لکھتا ہے کہ وہ صرف اپنے آپ کو کامل اور اپنی رائے کو معتبر جانتے تھے:

"سچ تو یہ ہے کہ فراقؔ صاحب سے ملنے کوئی فرحت نہیں ہوتی ان سے کوئی بحث نہیں کی جاسکتی تھی وہ صرف اپنی رائے کو کو صحیح سمجھتے تھے۔ اس کے خلاف ایک لفظ نہیں سُن سکتے تھے، مصاحبوں کی طرح اُن کی ہاں میں ہاں ملاتے رہیے تو ٹھیک ہے ان سے ذرا بھی اختلاف کیجیے تو بپھر جاتے تھے۔"(18)

ٹی ایس ایلیٹ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"30 سال کے بعد جو شاعر زندہ رہے وہ شاعر ہے"(19)

فراقؔ کے معاصرین نے فراقؔ صاحب کے بارے میں بہت کچھ لکھا لیکن ایک بات قابلِ توجہ ہے کہ اُن کی شاعری میں بڑے شعراء کی آواز سنائی دیتی ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ وہ ہر بڑے آواز سے متاثر ہوئے اس رنگ میں شاعری کی لیکن کسی آواز کے ساتھ ہم آہنگی پیدا نہیں کرسکتے۔ ایلیٹ ؔکا درج بالا قول اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ منفی تنقید کے باوجود فراقؔ آج بھی ایک توانا آواز ہے اور اُن کے شخصیت کی آڑ میں اُن کے فن پر وار کرنا کسی طور درست نہیں اور ویسے بھی بقولِ ظفرؔ اقبال:

بات یہ ہے کہ آدمی شاعر
یا تو ہوتا ہے، یا نہیں ہوتا(20)

فراقؔ صاحب کی نظم کے بارے ڈاکٹر گیان چند لکھتے ہیں:

"اگرچہ فراقؔ صاحب غزل کے شاعر ہیں لیکن بعض نظمیں بھی لکھیں مثلاً ہنڈولہ، دھرتی کی کروٹ، وغیرہ لیکن یہ نثری نظمیں تھیں اور احساسات سے عاری"(21)

فراقؔ صاحب کے بارے ڈاکٹر فردوس انور قاضی لکھتے ہیں:

"انگریزی ادب فراقؔ صاحب نے پڑھا ہی نہیں بلکہ پیا تھا"

بیشک فراقؔ کلاسیک تھے، ہندوؤں میں دو بڑے غزل کے شاعر ہیں فراقؔ اور چکبستؔ۔ فراقؔ گورکھپوری زندگی بھر آزادی اور پابندی کے درمیان سولی پر لٹکے آدمی کی طرح تھے۔۔۔ آزادی نے ان کی معاشرتی زندگی کی بے راہ روی اور لہجے کی اس بے باکی کو جنم دیا جس میں تہذیبی معاشرتی اور اخلاقی۔۔۔۔ ہر اعتبار سے بے لگامی کی کیفیت تھی۔ آخری عمر میں گھر میں اکیلے رہتے تھے لیکن دوسروں پر اپنا غم ظاہر کرنا گوارہ نہ تھا۔

حواشی وحوالہ جات

1. ابوالاعجاز حفیظ — کشاف تنقیدی اصطلاحات — مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد 1985 — ص72
2. محمد رضا ڈاکٹر — اُردو میں سوانحی ادب (فن اور روایت) — فکشن ہاؤس لاہور 2012 — ص231
3. "فنون" لاہور جون۔ جولائی 1974 — ص24
4. بشیر سیفیؔ ڈاکٹر — خاکہ نگاری فن و تنقید — نذیر سنز پبلیشرز لاہور 1993 — ص10
5. سلیم اختر ڈاکٹر — اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ — سنگ میل پبلیکشنز لاہور 1975 ص229
6. یحیٰ امجد ڈاکٹر — فن اور فیصلے — مطبع عالیہ لاہور 1969 — ص53
7. بشیر سیفیؔ — محولہ بالہ — ص80
8. مبین مرزا — اُردو کے بہترین شخصی خاکے — الحمرا پبلشنگ اسلام آباد — ص85
9. ایضاً — ص386
10. ایضاً — ص366
11. ایضاً — ص381
12. ایضاً — ص389
13. ایضاً — ص413
14. ایضاً — ص415
15. ایضاً — ص414
16. ایضاً — ص395
17. ایضاً — ص398
18. ایضاً — ص616
19. جمیل جالبی (ڈاکٹر) — ارسطو سے ایلیٹ تک — نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد — ص66
20. ظفرؔ اقبال — اُردو کے آٹھ غزل گو (جاوید شاہین) مرتّب — میری لائبریری لاہور 1968 — ص55
21. مبین مرزا — اُردو کے بہترین شخصی خاکے — الحمرا پبلشنگ اسلام آباد — ص613